حیاتِ قادر

مؤلف

عبید اللہ دُرّانی

باب نمبر ۱۳

سیر

بابا صاحب قریب کی پہاڑیوں اور باغات میں اکثر سیر کے لئے پیدل چلے جاتے ہیں۔ اگر کوئی شخص موٹر یا بس لے آئے اور اس پر سوار ہونے کی درخواست کرے تو کہیں دُور کا سفر اختیار کیا جاتا ہے۔ یہ خادموں کے لئے بڑی خوشی کا موقع ہوتا ہے کیونکہ یہ لوگ ابھی باطن کی سیر سے اچھی طرح واقف نہیں ہوتے اور ظاہر کی سیر میں تفریح ہو جاتی ہے۔ صبح سویرے بعد نماز فجر عموماً چل دیتے ہیں۔ اگر موٹر پانچ کی گنجائش والا ہو تو کم از کم دس ساتھی ضرور ہوتے ہیں۔ بابا صاحب کسی کا بھی دل دُکھانا نہیں چاہتے۔ خواہ آپ کو لمبے سفر میں جکڑے ہوئے اور سکڑے ہوئے بیٹھنے کی تکلیف برداشت کرنی پڑے۔ موتی نامی کتا روزانہ تو نہایت سنجیدہ اور متین رہتا ہے۔ مگر ایسے دن اس کی خوشی اور اچھل کود دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ چاہے اس کو کتنا ہی زنجیر میں باندھیں وہ لڑ جھگڑ کر سب سے پہلے بہترین سیٹ پر جا کر اس اطمینان سے بیٹھ جاتا ہے کہ گویا سارا انتظام اسی کی خاطر ہوا ہے۔ راجو ماسٹر صاحب جن کی عمر تقریباً پچھتر سال کی ہو گی اور جو چلنے سے قدرے معذور ہیں وہ بھی ایسے سفر سے نہیں چوکتے اور خوب پہاڑیوں اور جنگلوں میں پیدل چلتے ہیں۔ ذیل میں اس قسم کے تین سفروں کی تفصیل درج ہے جو اپنی جگہ ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں اور جن میں آیاتِ قرآن کی طرح اشارے اور نشانیاں ہیں۔

اسحٰق پٹنم:

یہ بندر گاہ وجے نگرم سے چالیس میل کے فاصلے پر ہے اور بے انتہا خوبصورت جگہ ہے۔ ساحل پر سب پہاڑیاں ہیں اور ان پہاڑیوں کے درمیان شہر واقع ہے اور بالکل پہاڑیوں کے دامن میں سمندر۔ اسی وجہ سے یہاں کا سمندری ساحل بھی بہت گہرا ہے اور بڑے بڑے جہاز بالکل اندر تک آجاتے ہیں۔ ایک چھوٹی سی پہاڑی کے اوپر حضرت اسحٰق مدنی رحمتہ اللہ علیہ کا مزار ہے اور چلہ گاہ ہے۔ یہ ایک عجیب پُر سکون اور پُر فضا جگہ ہے۔ رات کے وقت اگر یہاں قیام کیا جائے تو حجرے کے اندر گہرے سمندر کا شور اپنے اندرونی ولولے اور جوش سے کچھ ہم آہنگ معلوم ہوتا ہے۔

موٹر میں سوار ہو کر حضور بابا صاحب، دو چار خادم اور ایک دو مہمان شام کے وقت چلتے ہیں۔ اس بات کا لحاظ رکھا جاتا ہے کہ چاند کی منجھلی تاریخ ہو۔ موٹر سیدھی لبِ ساحل جا کر رُکتی ہے۔ نہایت ستھری اور صاف ریت پر سمندر کا نظارہ عجب بہار دکھاتا

ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سمندر نے چاند کا سارا جمال اپنے اندر سما لیا ہے اور اس کے دل کی دھڑکنیں موجیں بن بن کر ساحل پر نثار ہو رہی ہیں۔ روپہلی چادر میں اونچی اونچی موجوں کا سماں کچھ ایسی کیفیت پیدا کرتا ہے کہ گویا آسمان پر تو ایک چاند ہے مگر زیرِ آسمان اس سارے سمندر کی ایک ایک موج اپنے دل کی وسعتوں کو پھیلا کر ایک ایک چاند کو لپیٹے ہوئے ہے۔ یہ موجیں کیسی شان سے اُٹھتی ہیں۔ ساحل کی طرف بڑھتی ہیں اور ساحل سے ٹکرا کر اپنے آپ کو پاش پاش کر دیتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سمندر اپنی احاطہ بندی سے احتجاج کر رہا ہے اور اپنے جذبہ کو یوں نشر کر رہا ہے۔

چودھویں رات کے سمندر کا منظر باطن میں عجب کیفیت پیدا کرتا ہے جس طرح آسمان اپنی عظمت کی انکساری میں سرنگوں ہو کر حد نظر تک زمین سے آملتا ہے اور پھر اس کا نیلگوں عکس اس نیلگوں پانی میں کچھ اس طرح مل جاتا ہے کہ یہ بتانا مشکل ہوتا ہے کہ زمین کون سی ہے، آسمان کون سا ہے اور کس کے رُخ روشن کی کون آئینہ برداری کر رہا ہے۔ اسی طرح آج کی رات سمندر کا منظر اور اس کے شور سے ظاہر و باطن کا پردہ دور ہو جاتا ہے اور ھو الظاہر ھو الباطن کے ایک ہونے کی دل شہادت دیتا ہے۔ یہ شورش، یہ احتجاج، یہ سربلند موجیں، یہ موجوں کی سرفروشی سب کچھ صرف لب ساحل ہے۔ سمندر کی طرف آگے نظر بڑھائو تو سمندر کے وسط میں سکون ہی سکون ہوتا ہے۔ سمندر کا ظرف ہے اس قدر وسیع اور عمق۔ اس میں کوئی بھی چیز ڈال دیجئے تو تھوڑی دیر کے بعد ذرا سی جگہ بدل کر وہ باہر نکال دی جاتی ہے۔ سمندر میں دنیا بھر کی گندی چیزیں ڈال دی جائیں مگر اس کا پانی ہمیشہ پاک ہی رہتا ہے۔ اور ہر وہ چیز جو اس کے اندر پہنچے اس کو بھی پاک کر دیتا ہے۔ ہر جاندار چیز جب بے روح ہو جاتی ہے تو اس کے قالب کے اجزاء ٹوٹ ٹوٹ کر سمندر ہی میں پہنچتے ہیں اور سمندر ہی سے ابتدائے زیست ہوتی ہے۔ خشکی کے رہنے والے سمندر میں اپنے پیر بھگونے سے جھجکتے ہیں۔ مگر جیسے ہی سمندر کے قریب پہنچتے ہیں لاکھ اپنے دامن کو بچانے کی کوشش کریں تب بھی ایک نامعلوم موج ایسی آتی ہے کہ وہ خواہ شادہوں یا نشاد بھگو ہی دیتی ہے اور لوٹتے ہوئے ان کے پیروں تلے سے ایسی زمین کھسکتی ہے کہ گرنے اور بہہ جانے سے اپنے آپ کو بڑی مشکل سے بچاتے ہیں۔ پھر چودھویں رات کا طلسم ایک کرشمہ ہوتا ہے۔ اس دن سمندر جوش پر ہوتا ہے۔ یہی حال بزرگانِ دین کے عرس کے موقع پر بھی فیض حاصل کر لیں مگر عرس کے دن بلا امتیاز و تفریق ہر ایک فیضیاب ہوتا ہے۔

اسحق پٹنم کے سمندر کے کنارے ہم لوگ پالتی مار کو بابا صاحب کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ گھنٹہ گزر گیا۔ دو گھنٹے گزر گئے۔ ہر ایک اپنے حال میں غرق تھا۔ معلوم نہیں سمندر کی تہہ میں موتیوں کی تلاش تھی یا سمندر کی گہرائی معلوم کرنے کی۔ سمندر بھی خاموش تھا اور ہم لوگ بھی خاموش۔ یک لخت بابا صاحب کھڑے ہو گئے اور سر پر دونوں ہاتھ ملائے ہوئے سمندر کی طرف رُخ کر کے بالکل ساکت ہو گئے۔ آدھ گھنٹہ اسی حالت میں گزر گیا۔ خدا معلوم یہ سر پر دونوں ہاتھ رکھنا کیا معنی رکھتا ہے۔ کیا کوئی ذمہ داری

ہے جس کا بوجھ اٹھانا وہ بخوشی قبول کر رہے ہیں۔ اب وہ خادموں کی طرف رُخ کرتے ہیں اور باتیں ہوتی ہیں۔ رات کا وقت ہے۔ ساحل سے کوئی ڈیڑھ دو میل کے فاصلہ پر جہاز لنگر ڈالے کھڑے ہوئے ہیں۔ ان میں بجلی کے قمقمے جگمگا رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سمندر میں دو مضبوط قلعے ہیں۔ بابا صاحب کا ارشاد ہوتا ہے کہ ایک اور جہاز آنے والا ہے۔ وہ کاکی ناڈا سے آرہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے بہت سے بندرگاہ ہیں مگر سمندر ہر جگہ ایک ہی ہے۔ کہیں سمندر اوتھل ہے کہیں گہرا۔ گو لوگوں نے نام مختلف رکھ چھوڑے ہیں۔ یہ جہاز یوں تو قریب نظر آتے ہیں مگر ہیں بہت دور۔ سطح سمندر پر فاصلہ کا اندازہ بڑی مشکل سے ہوتا ہے۔

اس قسم کی پُر معنی گفتگو ہوتی رہی۔ اپنے اپنے ذوق اور ظرف کے مطابق سامعین گوہر معنی سمیٹتے رہے کہ تھوڑی دیر کے بعد دُور سے وہ تیسرا جہاز نظر آیا اور اشارہ ہوا دیکھو دیکھو وہ آگیا آگیا۔ وہ دیکھتے دیکھتے اس جہاز نے قدرے فاصلہ پر لنگر ڈال دیا۔ یہ تین جہاز اور ان میں بجلی کے قمقمے یہ سمندر اور یہ ساحل واللہ اعلم کس چیز کی طرف اشارے تھے۔ اس جگہ نزول و قیام کس لئے تھا اور اس خاموشی میں کیا ہوا۔ یہ اللہ بہتر جانتا ہے۔ پھر لبِ ساحل حضور چلنے لگے اور خادم بہت سے پیچھے پیچھے۔ ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ سمندر میں سے ایک چٹان بڑھ کر آگے کو نکلی ہوئی تھی اس پر چڑھ گئے۔ یہاں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ کس طرف رقیق پانی اپنے استقلال اور پیہم کوشش کی بدولت ان سخت چٹانوں کو گلا گلا کر ان کے اندر گھس آیا ہے اور وہ سارے نوک دار کونے گل گل کر ختم ہو گئے ہیں۔ محبت کا بھی یہی حال ہے۔ دشمن کتنا ہی سخت ہو، کافر کتنا ہی سیاہ قلب، فقیر کی محبت کا جوش ہر ایک کو اپنا لیتا ہے۔

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتحِ عالم

جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

شہر میں خبر ہو گئی کہ بابا صاحب تشریف لائے ہیں۔ کچھ لوگ موٹروں پر آئے۔ بابا صاحب سے ملاقات کی۔ کچھ مٹھائی اور چائے تقسیم ہوئی۔ اس کے بعد واپسی کے لئے سب لوگ موٹروں پر سوار ہو گئے۔ تقریباً آدھی رات کا وقت تھا۔ چاندنی میں سامنے کا منظر ایسا نظر آتا تھا کہ یہ امتیاز دشوار تھا کہ یہ خواب کی کیفیت ہے یا ہوش کی۔ نرم چاندنی میں ساری زندگی کی سختیاں ملائم دکھائی دیتی ہیں جیسے کسی حسین کے فیض محبت سے ہر چیز بخوشی و رغبت گوارا ہوتی ہے۔ چاندنی ہی چاندنی۔ دل میں سمندر کا سا جوش۔ اب من و تو کی کشمکش توحید کی وحدت میں غرق معلوم ہوتی ہے۔

کلنگ پٹنم:

یہ ایک دوسرے سفر کا ذکر ہے۔ ابھی رات شروع ہوئی تھی اور اندھیری رات تھی۔ سات آٹھ بجے کا وقت تھا کہ موٹر پر سوار ہر کر کلنگ پٹنم کو جو کہ ستر میل کے فاصلہ پر ہے، روانگی ہوئی۔ یہ بندر گاہ کسی زمانہ میں کافی عروج پر تھی مگر اب بالکل ویران ہے۔ بس ایک چھوٹا سا گاؤں رہ گیا ہے۔ اس جگہ کی اہمیت صرف ایک بزرگ کے مزار کی وجہ سے ہے۔ یہ بزرگ کوئی آٹھ صدی پہلے یہاں آئے تھے۔ یہ بارہ بھائیوں میں سے ایک بھائی تھے اور باقی سب کے سب شہید ہو گئے تھے۔ غالباً یہ بھائی مدینہ منورہ سے جہاز پر تشریف لائے تھے اور اس مشرقی ساحل پر معہ اپنے حلقوں کے پھیل گئے تھے۔ ان شہیدوں کے مزارات مدراس سے لے کر اڑیسہ کے ساحل تک اب بھی موجود ہیں۔ موٹر کو روک کر اس مزار شریف کے مجاور کو اطلاع دی گئی۔ مجاور چابی اور روشنی لے کر ایک نزدیک کے راستہ سے مزار پر پہنچ گیا۔ اور ہم لوگ ریتیلے راستوں سے موٹر کے ذریعہ پہنچے۔

یہاں ایک چھوٹا سا ناریل کا باغ ہے اور اس کی درمیان ایک عمارت ہے۔ جو آدھی سے زیادہ ریت سے ڈھک گئی ہے۔ سیر ھیوں سے اُتر کر ہم مزار کے اندر پہنچے اور جو اگر بتیاں ساتھ لے گئے تھے ان کو جلایا۔ یہ مزار تقریباً بیس اکیس فٹ لمبا تھا۔ اور اوپر چادر پڑی ہوئی تھی۔ حضور بابا صاحب نے چادر کو اُٹھایا ایک خادم کو بلا کر اس کے ہاتھ میں چادر دے کر فرمایا کہ یہ دیکھو مزار کتنا لمبا ہے۔ یہ روایت صحیح نہیں ہے کہ یہ بزرگ اس قدر لمبے تھے۔ حقیقت میں یہ دو قبریں ہیں۔ آپ کی اور آپ کے مرید کی جو آپ کے پائنتی دفن ہے۔ دونوں کو ملا کر ایک کر دیا گیا ہے۔ پھر ارشاد فرمایا کہ اس جگہ کو خوب گھوم کر دیکھو۔ اندر تہ خانے میں ان بزرگ کے گھوڑے کا بھی مزار ہے جو اسی جہاد میں آپ کے ساتھ شہید ہو گیا تھا۔ سب لوگ گھومنے کے بعد اوپر نکل آئے اور موٹروں میں سوار ہو کر واپس جائے قیام پر پہنچ گئے۔ مزار پر مشکل سے پندرہ منٹ رُکے ہوں گے۔ یہ ایک سو چالیس میل کا سفر، اندھیری رات، نہ کوئی راستہ کی تفریح، نہ کوئی دلفریب منظر۔ آخر صرف چند منٹ کے لئے وہاں کھڑے ہو کر لوٹ آنا کیا معنی رکھتا ہے۔

اگر اس روح سے ملاقات کرنی تھی تو کیا روحیں جو زندگی میں جسم میں مقید رہتی ہیں۔ انتقال کے بعد قبر میں مقید رہتی ہیں؟ یہ تو کچھ بعید از قیاس بات معلوم ہوتی ہے۔ ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ اکثر بزرگ انتقال کے صدیوں بعد ظہور میں آتے ہیں اور ان کا فیض جاری ہو جاتا ہے۔ کیا یہ کچھ ایسی ہی بات تھی۔ خدمتِ خلق کے لئے کیا کسی کو جگانا مقصود تھا یا جو خادم ساتھ تھے ان کی تعلیم مقصود تھی کہ دیکھو قرونِ اولیٰ کے فقیروں نے کس طرح اسلام کا علم بلند کیا۔ حق کی خاطر جہاں ماوشما کو آغوشِ محبت میں لیا وہاں باطل کو مٹانے کے لئے اللہ کے واسطے ہاتھ میں تلورا بھی اُٹھائی اور شہادت پر کر حیاتِ جاوید حاصل کر کے نہ صرف اپنی ہی دوامی عمر پائی بلکہ جب نصب العن کی خاطر اپنی جان دی۔ اس نصب العین کو بھی حیات جاوید بخش دی۔ کہتے ہیں مرتے وقت انسان کا جو حال ہوتا ہے، وہی حال انتقال کے بعد برقرار رہتا ہے۔ اگر انسان کو دنیا اور دنیا کی دولت و عظمت کھینچے ہوئے ہے اور مرتے

وقت انہی چیزوں کی یاد اور کشمکش میں جان نکل جائے تو روح بھٹکتی پھرتی ہے کیونکہ اس کو دنیا سے جو لگاؤ رہ گیا ہے اسے پورا کرنے کے لئے عالمِ ارواح میں کوئی سامان نہیں میسر آتا۔ اور شہید جب حق کے واسطے اپنا سر کٹاتا ہے اور اس کی گردن سے گرم خون جوش مارتا ہوا حق کے نعرے لگاتا ہے تو اسی زمین سے جس نے اس خون کو چوسا کبھی نہ کبھی کوئی مردِ مومن اُٹھ کر پھر سے حق کا بول بالا کرتا ہے۔ کیا اس قسم کی کوئی تعلیم ان بزرگ کے مزار کے ذریعہ دینی منظور تھی یا عشق و محبت کے کسی رمز کی طرف کوئی اشارہ تھا۔ اللہ اللہ وہاں اس پندرہ منٹ کے قیام کے لئے تکلیف کے ساتھ اتنا لمبا سفر اختیار کرنا ضرور کچھ نہ کچھ رمز رکھتا ہو گا۔

نارائن پٹنم:

جب اس مقام کی طرف سفر ہوا تو اتوار کا دن تھا اور مئی کی چوبیس تاریخ۔ گرمی شباب پر تھی۔ یہ ایسا دن تھا جسے اگنی کارتی کا دن کہا جاتا ہے۔ دکن میں یہ چودہ دن سخت گرمی کے ہوتے ہیں اور اس زمانہ میں اتنی گرمی پڑتی ہے کہ کہا جاتا ہے کہ اگر چٹانیں پھٹ جاتی ہوں تو عجب نہیں۔ بابا صاحب قبلہ اور ہم لوگ اس دن نو بجے کے قریب موٹر میں سوار ہو کر نارائن پٹنم کے سفر کے لئے چل دیئے۔ وجے نگرم سے جنوب و مغرب میں بیاسی میل کے فاسلہ پر واقع ہے۔ یہاں گھنے جنگل ہیں جن میں شیروں اور اژدھوں کی سلطنت ہے۔ اونچی اونچی پہاڑیوں، دشوار گذار گھاٹیوں اور بغیر پُل کے کئی دریائوں میں سے گزر کر اس جگہ پہنچا جاتا ہے۔ نارائن پٹنم جانے کا سلسلہ غالباً یوں ہوا کہ بابا صاحب قبلہ کے والد بزرگوار کے ایک دوست کے ہاں جنگل کی پیداوار کی تجارت کی غرض سے مقیم تھے۔ جب بابا صاحب کی عمر دس سال کی تھی تو آپ کی گائے کو جو سُوکھ گئی تھی اس جنگل میں چرا کر تازہ کرنے کے لئے بھیج دیا گیا تھا۔ جب وہ تازہ ہو گئی تو آپ کے والد محترم کے دوست نے اس گائے کو جنگل کے چند آدمیوں کے ساتھ معہ کچھ اس جگہ کی پیداوار کے آپ کے پاس بھیج دیا۔ بابا صاحب کے یہاں جنگل کے ان مہمانوں کی خوب خاطر مدارات کی گئی تھی۔ ان لوگوں کو چھوٹی چھوٹی مچھلیاں اور چاول بہت پسند تھے۔ یہ خرید کر دے دیئے جاتے تھے اور وہ ان کو پکا کر کھاتے اور بہت خوش ہوتے تھے۔ ان لوگوں نے کئی دن قیام کیا تھا۔

اس واقعہ کو گزرے چالیس سال ہو چکے تھے۔ شاید دل میں یہ خیال رہا ہو گا کہ اس جگہ کو ضرور دیکھنا چاہیے جو ہزاروں برس سے بغیر کسی تغیر کے چلی آرہی ہو گی۔ وہ جنگل کے درندے، اور اژدھے، وہ فطرت کی ظالم طاقتیں اور ان میں ان سیدھے سادھے انسانوں کا اپنی نسل کو قائم رکھنا ایک دیکھنے کی چیز تھی۔ لیکن جیسا کہ گذشتہ صفحوں میں کوئی بار اشارہ کیا گیا ہے، پیر کامل کا ہر کام اور اس کی بات معنی در معنی رکھتی ہے، اس بلا کی گرمی یعنی اگنی کارتی میں تین دن ایسے ہوتے ہیں کہ دن کے وقت ایک چڑیا تک

حرکت نہیں کر سکتی۔ سڑکیں خالی ہوتی ہیں تمام لوگ گھروں میں بند ہو جاتے ہیں اور گرمی اور دھوپ سے چھپنے لگتے ہیں۔ اور ہم تھے کہ برستی آگ میں عازمِ سفر ہوئے۔ پچاس میل پکی سڑک پر وہاں جانا تھا جہان پاربتی پور ایک چھوٹا سا شہر آباد تھا۔

اس شہر تک پہنچنے سے پہلے ہی بائیں ہاتھ کو سڑک مڑتی ہے جو پہاڑیوں اور جنگل میں نکل جاتی ہے۔ یہاں سے تیس میل پر نارائن پٹنم ہے۔ سڑک اتنی خراب ہے کہ موٹر کا سفر تو کیا بیل گاڑی پر بھی گزرنا مشکل ہے مگر ہم ہیں کہ دھکے کھاتے لوٹتے پیٹتے لشتم پشتم چلے جارہے ہیں۔ جیسے جیسے دن بڑھ رہا ہے گرمی کی شدت تیز ہوتی جاتی ہے۔ پیاس کے مارے ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی ہیں، اور ہم ہیں کہ ایک کالے رنگ کے بند موٹر میں بڑھے چلے جارہے ہیں۔ موڑ سے دس میل کے فاصلہ پر ایک کافی چوڑی ندی میں تقریباً گھٹنے گھٹنے پانی ہو گا۔ اس ندی کے پاس ہی ایک کیت کے درخت کے نیچے موٹر روک دی گئی تا کہ ذرا سستا کر اور پانی پی کر آگے روانہ ہوں۔

دن کے بارہ بجے کا وقت ہو گا۔ ایسی سخت لُو چل رہی تھی کہ الامان الحفیظ۔ جتنا پانی ساتھ تھا وہ اس قدر کھول رہا تھا کہ پینے کا تو کیا ذکر منہ میں لیتے ہی قے ہو جاتی۔ ندی میں جا کر دیکھا تو وہ پانی بھی اس قدر کھول رہا تھا کہ پیر تک نہ ڈالا جاتا تھا۔ صرف موٹر ہی نہیں بلکہ اندر کی گدیاں تک ایسی تپ رہی تھیں کہ بیٹھنا مشکل تھا۔ باہر کوئی سایہ دار درخت بھی نہ تھا جس کے نیچے پناہ لے سکیں۔ طرفہ تماشہ یہ گرمی کے مارے سب لوگوں کو دست آنا شروع ہو گئے۔ ندی کے پاس تپتے ریت میں بھاگ بھاگ کر جاتے تھے اور فارغ ہو کر آتے تھے۔ اللہ کی پناہ، حشر کے میدان میں شاید اسی قسم کی حالت ہو گی۔ بیچارہ موتی جس کے لمبے لمبے گھنے بال تھے، بہت پریشان اور بے حال تھا۔ تقریباً ایک گھنٹہ تک ہم لوگ اس درخت کے نیچے رُکے رہے۔ کچھ دہی ساتھ تھا جس کو اسی گرم پانی میں گھول کر پی لیا۔ آگے بڑھنے کی ہمت کچھ ڈانواں ڈول ہو رہی تھی کہ ڈرائیور نے اطلاع دی کہ پٹرول تو صرف دس میل تک کے لئے کافی ہے۔ لوٹ کر پاربتی پور تو پہنچ سکتے ہیں مگر آگے بڑھے تو بیچ جنگل میں رُک جائیں گے۔ ڈرائیور کی اس کوتاہ اندیشی پہ جو غصہ آیا اس کا کیا بیان کیا جائے۔ بابا صاحب خاموش تھے نہ کچھ اِدھر کی کہتے تھے نہ اُدھر کی۔ خدام نے جوں توں کر کے بابا صاحب کو گاڑی میں بٹھایا اور موٹر پھر واپس لوٹی۔ وجے نگرم کوئی سولہ میل رہ گیا تھا کہ موٹر کا ایکسل ٹوٹ گیا اور کار سڑک پر ہی رُک گئی۔

واپسی میں بھی ہر ایک کا بُرا حال تھا۔ موتی بیچارے کا کچھ نہ پوچھئے تقریباً سارا وقت قبلہ بابا صاحب کی گود میں ہی بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر کے لئے جب وہ کسی اور کی گود میں آگیا تو بابا جان نے اپنے جبہ مبارک کی طرف اشارہ کیا جس پر کتے کی غلاظت کے پیلے پیلے داغ لگے ہوئے تھے۔ وہی بابا جان جن کی نفاست طبع، پاکیزگی اور ستھرا پن ضرب المثل ہے۔ بظاہر ان کی طبیعت پر اس غلاظت سے کوئی مَیل نظر نہ آتا تھا اور چہرۂ مبارک پر ذرہ برابر کراہیت یا بیزاری نہ تھی۔ ان بزرگانِ دین کے ظرف کو کوئی کیا پا سکتا ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک بس کو روکا گیا اور اس میں سوار ہو کر مغرب کے وقت سب لوٹ آئے۔ کوئی کھانا کھانے کے لئے دوڑا تو کوئی بدحال ہو کر پانی پی کر سو رہنے کے لئے۔ مگر باباصاحب غسل فرما کر پھر ویسے کے ویسے اپنے معمولات میں مشغول ہو گئے۔

اس وقعہ کو پورے تیئس دن گزر جاتے ہیں کہ پھر نارائن پٹنم جانے کا ارادہ ہوتا ہے۔ اب مون سون کی بارشیں شروع ہو گئی تھیں اور ہر طرف سبزہ نظر آتا تھا۔ ساری فضا اور جنگل دُھل کر تازہ اور شگفتہ ہو چکے تھے۔ راستہ چونکہ خراب تھا اس لئے دو جیپ کاروں کا انتظام کیا گیا ساتھ ساتھ یہ بھی خیال تھا کہ بارش کا موسم ہے۔ اگر ان پہاڑی ندیوں میں پانی آ گیا تو ان کو پار کرنا ناممکن ہو جائے گا۔ اگلے دن یعنی سترہ جون کو صبح سویرے چلنے کا عزم تھا اور گاڑیاں تیار کی جا رہی تھیں کہ سول کی شام کو دفتر موسمیات سے خبر ملی کہ اگر دو دن میں سخت بارش اور طوفان کا احتمال ہے۔ آسمان ابر سے گھرا ہوا ہے اور بارش شروع ہو چکی ہے۔ راستہ کا یہ حال تھا کہ جو چوڑی ندیاں تھیں ان پر پُل نہ ہونے کے وجہ سے کوئی بھروسہ نہ کیا جا سکتا تھا۔ یہ عام طور پر علم تھا کہ ندیاں اپنے جوشیلے دھاروں کی وجہ سے بڑی خطرناک ہو جاتی ہیں اور کہیں کہیں تو ایسا ہو جاتا ہے کہ جب لوگ بیچ ندی میں ہوتے ہیں تو یکدم کسی موڑ سے اتنی اونچی پانی کی دیوار چلی آتی ہے کہ موٹر اور بیل گاڑی تک اس میں بہہ گئی ہیں اور کتنی ہی جانیں ضائع ہوئی ہیں۔ جب طوفان اور ندیوں کے خطرات کی باباجان کو اطلاع دی گئی تو آپ نے تھوڑی دیر کے لئے آنکھیں بند کر لیں اور خاموش ہو گئے۔ پھر بڑے جوش میں فرمایا کہ میرا دل رجوع ہے، طوفان وغیرہ کچھ نہیں۔ وجے نگرم سے آٹھ میل کے فاصلہ پر نہایت خوشگوار موسم ہو گا اور ہمارے ارادہ کو شاندار کامیابی ہو گی۔

چنانچہ دوسرے روز صبح ساڑھے پانچ بجے چودہ آدمی معہ موتی کے دونوں جیپ کاروں میں سوار ہو کر چل دیئے۔ اس وقت بڑا خوشگوار موسم تھا۔ گہرے گہرے کالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ پہاڑیوں اور جنگل کا نظارہ دلفریب تھا۔ نہایت اطمینان اور لطف سے اسّی میل کا سفر طے ہوا اور نارائن پٹنم پہنچ گئے۔

نارائن پٹنم ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جو پہاڑیوں اور ان کے دشوار گزار راستے طے کرنے کے بعد ایک وسیع وادی میں واقع ہے۔ یہاں چاروں طرف پہاڑیوں پر لوگ کاشت کرتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے کھیت اور یہ وادی بڑا ہی دلکش منظر پیش کرتے ہیں۔ نارائن پٹنم میں ہم لوگ صرف گھنٹہ بھر ٹھہرے کچھ آم جو ساتھ تھے کھائے گئے اور چائے پی کر پھر واپسی کے لئے موٹر پر سوار ہوئے۔ راستہ میں پہاڑیوں پر جہاں جہاں نہایت ہی دلفریب منظر تھے وہاں اُتر کر تھوڑی تھوڑی دیر سیر کی۔ اسی تفریح اور چہل قدمی کے وقت ارشاد ہوا۔ ہمارے اس سفر کا مقصد کیا ہے آخر اسے پورا کرنا کیوں ضروری ہے۔ عجب شان ہے۔ کس قدر لطف کے ساتھ یہ پورا ہوا۔ اُدھر وہ قیامت خیز گرمی اور ناکامی، اِدھر یہ لطف اور کامرانی۔ مالک کی عجب شان ہے۔ وہ دیکھو تین طوطے اُڑ کر جا

رہے ہیں۔ یہ دیکھو سامنے پہاڑیوں کا سلسلہ۔ یہ سب سے آگے جو لمبا پہاڑ ہے یہ سب سے نیچا ہے۔ اس کے پیچھے پھر دوسرا پھر تیسرا اور چوتھا ایک دوسرے سے بہت اونچے ہیں۔ اور کافی فاصلہ پر ہیں مگر یہاں دیکھئے سب ایک دکھائی دیتے ہیں۔

حضرت ابراہیم خلیل اللہ پیغمبر تھے اس لئے ہاتھ پیر باندھ کر ان کو آگ میں جھونکا گیا۔ اللہ جل شانہٗ کے حکم سے آگ گلزار بن گئی۔

یَانَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا وَسَلَامًا عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ

(اے آگ ٹھنڈی اور سلامتی ہو جا ابراہیم پر)

اللہ کا عشق (نار) جب کامل ہو جاتا ہے تو مولیٰ کے حکم سے وہ ایک گل بن جاتا ہے۔ اس کی خوشبو فیض رسانی کرتی ہے۔ اس کا رنگ اور اس کی مسّی جنت نگاہ ہوتی ہے۔ وہ اپنی جگہ پر قائم ہوتا ہے اور اس کی خوشبو سے مخلوق کھنچ کھنچ کر چلی آتی ہے۔ حوریں رس چوستی ہیں۔ خوبصورت تتلیاں نثار کرتی ہیں اور کوئی کوئی بلبل بھی دیوانہ وار اپنے گیت سُنا سُنا کر اپنی جاں ہلاک کر دیتی ہے۔ واقعہ ابراہیم ایک تاریخی واقعی ضرور ہے لیکن قرآن کریم کی ہر آیت کی طرح یہ بھی ایک اشارہ ہے۔ وہ پیغمبر تھے۔ ہاتھ پیر باندھ کر آگ میں پھینک دیئے گئے اور آزمائش سے نہ بچے۔ حضرت جبرائیلؑ نے حاضر ہو کر عرض کیا اجازت ہو تو آپ کو اپنے پروں پر بٹھا کر آگ سے بچالوں۔ مگر حضرت ابراہیمؑ اللہ اور اپنے درمیان کسی سہارے کو کب گوارا کر سکتے تھے خواہ وہ سہارا اللہ کا بھیجا ہوا ہی کیوں نہ ہو۔ وہ تو خیر پیغمبر تھے مگر اور لوگوں کو آگ میں کودنے یا نہ کودنے کا قیامت خیز فیصلہ خود کرنا پڑتا ہے۔ اور کوئی ضروری نہیں کہ دل کڑا کر کے ایک دفعہ کود بھی جائیں تو آگ گلزار ہی بن جائے زیادہ امکان اسی بات کا ہوتا ہے کہ جل کر خاک ہو جائیں گے مگر جب مولیٰ کا حکم ہوتا ہے تو انسان فیصلہ کرے یا نہ کرے یا اِدھر یا اُدھر کود ہی جاتا ہے۔ پھر وہ قلب جو ایک آتش فشاں کی طرح گرجتا تھا اور آگ اُگلتا تھا۔ وہی ایک گُل بن جاتا ہے۔ اور دنیا کے لئے ایک احسان بن جاتا ہے۔ دنیا کا ایک سال بارگاہِ قدس کا ایک دن ہے۔ ان دو سفروں کے درمیان ۲۳ دن گزرے تھے تو اشارہ سے ۲۳ سال بعد امن و آشتی کا سفر کرنا مقصود تھا۔

جبرئیل علیہ السلام نے رسول کریمؐ سے معانقہ کر کے آپ پر سارے علم روشن کر دیئے تھے۔ ایسے ہی علم لدنی کی چابی کسی اللہ والے سے ہی مل سکتی ہے۔ قرآن کریم اگر پڑھنا ہے تو کسی فقیر کے زیرِ سایہ کچھ دن گزارنے چاہئیں۔ کیونکہ ان کی زندگی کا ہر پہلو کسی نہ کسی آیتہ کریمہ کی تفسیر ہوتا ہے۔ جامہ عرفان خرقہ اویس اس کی منزلت اور معنی تو کوئی گدڑی پوش ہی جانتا ہے۔ دل عجب چیز ہے، اور ٹوٹا ہوا دل اس سے بھی عجیب تر۔ ذات کی خوشبو عشق ہے۔ صفات ایک جامہ ہے۔ نار جلال ہے۔ گل جمال ہے۔

ذات ان دونوں سے ماورا ہے۔ غرض بابا صاحب یہ اسرار کھولتے جاتے تھے اور اپنے دائیں ہاتھ ایک گلاب لئے ہوئے اسی پھول کی طرح مسکراتے ہوئے ٹہل رہے تھے۔ اللہ اکبر!

جلالِ کبریائی در جمالِ مصطفیٰ دیدم

(شان کبریائی کا جلال مصطفیٰ کے جمالِ دل ربائی میں دیکھا)

لبِ خار پر ہے گلوں کی کہانی　　بہار غم عشق ہے جاودانی

صلہ ہے یہی جستجو آرزو کا　　یہاں رب ارنی وہاں لن ترانی

سر دوش زلفوں کی کالی گھٹائیں　　رُخِ یار جام مے ارغوانی

اُجالا اُجالا ہے ان کا تصور　　انہیں کا ہے پرتو، مری زندگانی

سرِ طور موسیٰ کو بے ہوش کر کے　　چلے آئے کہتے ہوئے من رأنی

تصویر میں پیری کی چلمن جو اُٹھی　　نظر آئی معصومیت کی جوانی

یہی حُسن اور عشق کی ہے حقیقت　　سمندر میں موجوں کی جیسے روانی

مری ابتدا ہی مری انتہا ہے　　مطالب سے اب بن گیا ہوں معانی

(رحمن بابا)

☆...☆...☆